مشائخِ سندھ کی سوانح نگاری

(محرکات، اسلوب اور تحقیقی تجزیہ)

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش☆

Biographical literature of patriarch of Sindh

Dr. Zulfiqar Ali Danish

Abstract:

Biography has always been a primary part of monastic literature. Biography is a important medium of reformatory and mental training to the masses especialy the pople who attach themselves with monastic System. Therefor the trend of biography is found in every monastic group. At least all the patriarch of Sindh wrote biographies. In the article, the biography of the people of different classes of monastic thought are critically discussed with particular reference of their stimuli and style. The diction and style of these biographies are simple, easy and fluent so that the common man can comprehend their true sense. Some of these biographies have touch of literature. But they are lacking research technicalities. These biographical literature will always remain pleasant and beneficial.

Key words:

Biography, Monastic literature, Monastic System, Patriarch, Sindh, Reformatory, Training

کلیدی الفاظ:

سوانح نگاری، سندھ، اسلوب، تربیت، روحانیت

سوانح نگاری میں کس نوع کی معلومات ہونی چاہیے ؟ اس کا اسلوب کیا تقاضا کرتا ہے؟ معیاری سوانح کن صفات کی حامل ہونی چاہیے؟ ان سولات کے جوابات میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ مگر سوانح نگاری کے نقاد اس نکتے پر متفق ہیں کہ اس میں کسی فرد کے حالات زندگی مفصّل بیان کیے جاتے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جامعہ کراچی

ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی کے بقول ''سوانح عمری وہ صنف ادب ہے، جس میں کسی فرد کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام واقعات، اس کی ذہنی و عقلی نشو و نما کے مختلف مراحل اور اُس کے شخصی کارناموں وغیرہ کو بہ تفصیل بیان کیا جائے۔''(۱) مذکورہ تعریف میں "وفات تک کے تمام واقعات'' درج کر کے سوانح کو محدود کیا گیا ہے۔ اس تعریف کی روشنی میں کسی زندہ افراد کے حالاتِ زندگی یا سوانح کو قلم بند نہیں کیا جا سکتا جو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ''تمام واقعات'' کی شرط بھی بآسانی پوری نہیں کی جا سکتی۔ البتہ ممدوح کی زندگی کے بیش تر یا اہم واقعات کو تحریر کرنے ہی سے ممدوح کی درست شخصیت نمایاں ہو سکتی ہے۔ جہاں تک معیاری سوانح کا پہلو ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سوانح نگار میں غیر جانب داری کی صفت موجود ہو۔ مگر اس غیر جانب داری سے مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ممدوح کے حالات بیان کرنے میں کردار کُش واقعات کو زیبِ قرطاس کیا جائے۔ جہاں تک خامیوں کا تعلق ہے تو ایسے واقعات میں ایسے اسلوب کو اختیار کیا جائے۔ جس میں ہمدردانہ، اشاراتی اور ادبی رنگ ضروری ہے۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے کہ سوانح نگار اپنی تحریر میں سادگی، عام فہم معیاری اور ادبی الفاظ کا چناؤ کرے۔ جملوں کی ساخت میں پیچیدگی نہ ہو بلکہ یہ جامع ہونے کے ساتھ ادبیت کے حامل ہوں۔

سوانح نگاری کے لیے جس شخصیت کو منتخب کیا جاتا ہے۔ عموماً وہ اہم، معروف، نام ور اور مشہور ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ ''غیر معروف، معمولی اور گم نام انسان بھی سوانح نگاری کا موضوع بن سکتا ہے۔''(۲) عمومی طور پر سوانح نگار کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کرتا ہے جو مشہور ہو یا نہ ہو مگر اعلا صفات کی حامل ضرور ہوتی ہے۔ سوانح نگاری میں اسلوب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ حالاتِ زندگی کے بیان میں سوانح نگار آزاد نہیں ہو سکتا، وہ اسلوب ہی کے ذریعے سوانح کو قاری کے لیے دلچسپ اور معاشرے کے لیے مفید بنا سکتا ہے۔

پروفیسر فیاض احمد کاوش وارثیؒ کی کتاب ''آفتابِ ولایت'' حضرت وارث حسن شاہؒ کی سوانح حیات ہے۔ صاحبِ سوانح فیاض کاوشؒ کے مرشد تھے۔(۳) یہی وجہ ہے کہ اس سوانح میں عقیدت کا رجحان جابجا نظر آتا ہے۔ یوں تو بزرگان کی حیاتِ مبارکہ جو بھی مصنف تحریر کرتا ہے، اس میں یہ پہلو کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے بلکہ خانقاہی ادب کی بیش تر سوانحوں کے پس منظر میں عقیدت کا محرّک کسی نہ کسی صورت دکھائی دیتا ہے۔

''آفتابِ ولایت'' میں سوانح کی بہت سی خوبیاں یک جا ہیں۔ کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصّے میں حالاتِ زندگی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ جس میں آپ کی ولادت، تعلیم وتربیت، عہدِ طفولیت، خاندانی حالات، عادات وخصائل، نسب نامہ، شجرہ، بیعتِ طریقت، دستارِ خلافت اور اسفار کے حالات اور مشاہرین کی آپ سے عقیدت کو تحریر کیا گیا ہے۔ اِن میں سر سید احمد خان، علامہ اقبال، خواجہ حسن نظامی، گورنر جنرل ملک غلام محمد، ریاض خیر آبادی، سر شیخ عبدالقادر وغیرہ اہم ہیں۔ کتاب کے آغاز میں حرفِ آغاز، تعارف اور افتتاحیہ کے عنوان سے بالترتیب سوانح نگار، صغیر حسن خاں زبیری، اور ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعودؒ کی تحریریں شامل ہیں جن سے وارث حسن شاہؒ اور مصنف اوران کے طرزِ تحریر کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

اس سوانح میں صرف وارث حسن شاہؒ کے حالاتِ زندگی ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے متعلق دیگر پہلوؤں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ معلومات کو عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کی فہرست مع صفحہ نمبر دے کر قاری کو مطلوبہ معلومات تک رسائی میں آسانی فراہم کی گئی ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ آپ کے زیادہ سے زیادہ مستند حالات پیش کیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے آپ نے ۲۳ کتب سے استفادہ کیا ہے۔ خاندانی حالات کے ضمن میں مصنف نے ہلاکو خان کے ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ میں بغداد پر حملے کا ذکر کیا ہے کہ اُس عہد میں وارث حسن شاہؒ کے جد امجد مولانا سید اشرف ابی طالبؒ اپنے بال بچوں کے ہم راہ نیشا پور سے ہجرت کر کے ہندوستان کے ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے قصبے رسول پور میں آباد ہوئے۔ اِس واقعے کے چار سو سال بعد آپؒ کے خاندان کی اہم ہستی سید عبدالاحدؒ اپنے خاندان سمیت رسول پور سے دیوہ چلے آئے۔[۴] صوفیانہ شاعری کے ایک اہم نام بیدم وارثیؒ کی بیعت کا تذکرہ بھی کتاب کی زینت بنا ہے، جس کا کلام اکثر محفلِ سماع اور دیگر مجالس میں پڑھا جاتا ہے۔[۵]

''آفتابِ ولایت '' کے پہلے حصّے میں آپؒ کی وہ نصیحتیں بھی شامل ہیں، جن سے سماج میں سدھار پیدا ہو سکتا ہے کیوں کہ سید وارث حسن شاہؒ کا طریقہ 'بیعتیہ' تھا کہ جسے بھی مریدین میں شامل کرتے، اُسے کچھ نہ کچھ نصیحتیں ضرور فرماتے۔ جوانوں کو عموماً یہ نصیحت کرتے کہ ''ماں باپ کی خدمت سے غافل مت ہونا۔''[۶] سرکاری حکّام سے فرماتے کہ ''صاف رہنا چاہیے۔۔۔صاف رہنا چاہیے۔ اگر کوئی ایک لاکھ روپے دے تو پیشاب کر دے، لعنت بھیجے۔'' پولس والے کو یہ نصیحت فرماتے: ''اب

رشوت نہ لینا خدا مالک ہے۔" درزی کو نصیحت فرماتے "اب کپڑا چوری نہ کرنا۔"(۷) غرض جیسا تقاضا ہوتا، اُسی کے مطابق نصیحت فرماتے، اسی طرح عادات وخصائل کے ضمن میں کئی واقعات ایسے ہیں، جن سے فرد اور معاشرے کی تربیت و اصلاح ہو سکتی ہے۔ انھیں آپؒ کے ملفوظات میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ غریب پروری کے حوالے سے ایک مستری محمد سلیم کے ہاں قیام فرمایا اور والیٔ ریاست راجا پیاگپور کے ہاں قیام نہ فرمایا۔ آپ کو خود نمائی سے نفرت تھی۔ آپ ہر چھوٹے بڑے سے، اس انداز سے ملتے تھے، جیسے کوئی بہت ادنادرجے کا شخص ملتا ہے۔ آپ کی تعلیم یہی تھی کہ "اپنی ہستی سے گزر جاؤ۔"(۸)

دوسرے حصّے میں وارثی سلسلے کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں، جس میں ایک تو اس پہلو کی جانب اشارہ ہے کہ آپؒ نے کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا مگر احرام پوش بیعت لینے کے مجاز تھے۔ اس کے علاوہ تجریدیت وارثی سلسلے کے خاص بزرگوں کی نشانی ہے۔ نقش و تعویذ اور عملیات کی بھی سلسلہ وارثیہ میں ممانعت ہے۔ احرام کا رنگ زرد منتخب کیا، جسے اہلِ فنا سے خاص نسبت ہے۔

اس کتاب کا اولین محرّک تو سوانح سے یہ پتا چلتا ہے کہ صاحب سوانح سے سوانح نگار کو خاص عقیدت تھی، اسی لیے کتاب کا انتساب بھی اپنے مرشد کے نام معنون کیا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ سید وارث شاہؒ پر ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی۔ اِس کتاب کی تکمیل سے یہ ضرورت پوری ہو گئی۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے کئی لوگوں کو اصلاح مل سکتی ہے۔

اس سوانح کی سب سے اہم خصوصیت اس کا اسلوبِ بیان ہے۔ راقم نے سوانح نگار کے ساتھ ایکی کالج میں تدریسی فرائض انجام دیے ہیں ۔ آپ گفتگو میں بھی انتہائی شستہ اردو استعمال کرتے تھے۔ زیرِ بحث کتاب میں اندازِ بیان دل نشینی لیے ہوئے ہے۔ الفاظ کا چناو انتہائی موزوں ہے۔ جملے مختصر اور سادے ہیں۔ حسبِ موقع اشعار کا استعمال تحریر کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اسلوب کے بارے میں ڈاکٹر محمد مسعودؒ کی رائے پیشِ خدمت ہے۔

> "عوام الناس کے استفادے کے خیال سے اس تالیف میں سلیس، صاف اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ اندازِ بیان دل نشین۔ اختصار کو بہر حال پیشِ نظر رکھا ہے۔' اس سے قبل وارث شاہ کے سیرت نگاروں نے عبارت آرائی کے جوہر دکھاتے ہوئے جن باتوں کو کئی کئی صفحات میں پھیلا کر پیش کیا تھا۔ فاضل مؤلف نے ان کے نفس مصنف کو انتہائی

اختصار سے چند سطروں کے اندر سیدھی سادی عبارت میں پیش کر دیا ہے۔ سوائے ان چند مخصوص مواقع کے، جہاں کوئی خاص تاثر پیش کرنا مقصود تھا۔"(۹)

کتاب میں کچھ مقام پر عقیدت کا عنصر اور نامکمل تحقیقی انداز نظر آتا ہے۔ بالخصوص بچپن کے حالات میں جذبات کا غلبہ دکھائی دیتا ہے لیکن سوانح نگار نے اکثر مقام پر جو وضاحت طلب نکتے پیش کیے ہیں، ان کے لیے دلیل کا سہارا لیا ہے۔ کتابوں کے نام پاورقی حوالے میں دیے ہیں مگر صفحہ نمبر وغیرہ درج نہیں کیے۔ جب کہ محولہ کتب کی اشاعتی تفصیل کتاب کے آخر میں مکمل دی ہیں۔ اسلوب کی مثال دیکھیے۔

"یہ کس مہکے ہوئے رنگین گل کا تذکرہ نکلا
کہ عطر و مشک و عنبر سے بھرا کنجِ دہن میرا

حسینی باغ کا یہ حسین پھول یکم رمضان المبارک کو کھلا تھا، اس لیے سارے ماہِ مبارک کبھی اس نومولود نے دن میں دودھ نہ پیا اور نہ ہی بھوک سے بے تاب ہو کر رویا چلّایا بلکہ نہایت صبر وسکون سے سحری کے وقت سے لے کر افطار کے وقت تک بغیر دودھ کے رہا۔ غرض یہ کہ عید آئی، بچے نے دن میں دودھ پیا مگر پھر بھی عام بچوں کی طرح گھبراتے ہوئے جلدی جلدی نہیں بلکہ نہایت صبر وسکون کے ساتھ اور عام بچوں کی خوراک کے مقابلے میں مقدار میں بہت کم! اس کے علاوہ نہ کبھی بے وضوماں کا دودھ پیا اور نہ کبھی مقررہ وقت کے علاوہ دودھ کی طرف رغبت کی۔ نیند اوّل تو آتی ہی بہت کم تھی اس پر بھی کبھی غفلت کی نیند سوتے نہیں دیکھا اور جب جاگتا تو ہمیشہ ہنستا کھیلتا ہُوا اٹھتا۔ عام بچوں کی طرح منہ بسورتا بھی نہ دیکھا گیا بلکہ اکثر خاموش پایا گیا۔۔۔ کسی گہرے خیال میں گم۔۔۔ آنکھوں میں انتظار کی کیفیت۔"(۱۰)

پروفیسر فیاض کاوشؔ کی کتاب "آفتابِ ولایت" کی اشاعت دوم، مکتبہ وارثیہ میرپور خاص نے ۱۹۹۰ء میں کی، اس کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہُوا۔ حرفِ آغاز سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی طبع اوّل ۱۹۷۵ء/۱۳۹۵ھ میں ہوئی ہے۔ اس کتاب کا ایک اور خوب صورت ایڈیشن آپؒ کے وصال کے بعد مکتبۂ وارثیہ، جہلم سے شائع ہُوا۔ اس میں آپ کے حالاتِ زندگی اور کتب کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

بابا تاج الدین ناگ پوریؒ کے نواسے محمد عظیم برخیا المعروف قلندر بابا اولیاؒ نے بھی بابا تاج الدینؒ کے مختصر حالات ''تذکرہ تاج الدین باباؒ'' قلم بند کیے ہیں۔ یہ مختصر تذکرہ سہیل احمد عظیمی کی کتاب ''بابا تاج الدین'' کے آخر میں شامل کِیا گیا ہے۔ انھوں نے بھی آپ کی کرامتوں کے تذکرے جو اوّل گجراتی اور پھر اردو، ہندی میں ترتیب دیے گئے تھے۔ ان سے استفادہ کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ نے ان میں سے کچھ کرامتوں کی علمی توجیہ بھی پیش کی ہے۔ اس کا اندازِ تحریر بھی علمی نوعیت کا ہے۔ اس بارے میں قلندر بابا اولیاؒ نے کتاب کے آغاز ہی میں لکھا ہے:

> ''وہ ''بابا تاج الدین'' صرف خصوصی مسائل ہی میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی اپنی گفتگو کے اندر ایسے مرکزی نقطے بیان کر جاتے تھے جو براہِ راست قانونِ قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہیں، بعض اوقات اشاروں اشاروں ہی میں ایسی بات کہہ جاتے، جس میں کرامتوں کی علمی توجیہہ ہوتی اور سننے والوں کی آنکھوں کے سامنے یک بارگی کرامت کے اصول کا نقشہ آجاتا، کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ اُن کے ذہن سے تسلسل کے ساتھ سننے والوں کے ذہن میں روشنی کی کرنیں منتقل ہو رہی ہیں اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور حاضرینمن و عن وہ بات اپنے ذہن میں سمجھتے اور محسوس کرتے چلے جاتے ہیں جو ناناؒ کے ذہن میں اس وقت گشت کر رہی ہے۔"(۱۱)

زیرِ بحث تذکرہ روحانی سائنس کی اوّلین کتب میں سے ہے۔ اس میں اندازِ تحریر دو قسم کے ہیں۔ کرامات کے ذکر میں تو انداز بیانیہ اور سادہ ہے۔ جہاں کرامات کی علمی توجیہ بیان کی گئی، وہاں اسلوبِ بیان علمی نوعیت لیے ہوئے ہ۔، جس کی تفہیم عام قاری کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے سائنس کی آگاہی بہت ضروری ہے۔ آخری الذّکر کی مثال دیکھیے:

> ''مَیں یہ کہہ چکا ہوں کہ تفکّر، انا، اور شخص ایک ہی چیز ہے، الفاظ کی وجہ سے ان میں معانی کا فرق نہیں کر سکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اَنا، تفکّر اور شخص ہیں کیا؟ یہ وہ ہستیاں ہیں جو لاشمار کیفیات کی شکلوں اور سراپا سے بنی ہیں، مثلاً بصارت، سماعت، تکلّم، محبت، رحم، ایثار، رفتار، پرواز وغیرہ۔ اِن میں ہر ایک کیفیت؛ ایک شکل اور سراپا رکھتی ہے۔ قدرت نے ایسے بے حساب سراپا لے کر ایک جگہ جمع کر دیے ہیں کہ الگ الگ پرت ہونے کے باوجود ایک جان ہو گئے ہیں۔''(۱۲)

"تذکرہ بابا تاج الدین کو مکتبہ بابا تاج الدین کراچی نے شائع کیا تھا۔ اس کا سنِ تصنیف ۱۹۷۸ء سے قبل کا ہے، کیوں کہ قلندر بابا اولیاؒ کا وصال ۲۷ جنوری ۱۹۷۸ء کو ہُوا تھا، اس کی اولین اشاعت پر بھی سَن نہیں دیا گیا تھا۔"(۱۳)

"پیرانِ پیر" جیسا کہ نام ہی سے ظاہر کہ یہ کتاب "عبد القادر جیلانیؒ" کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ اس کے مصنف پروفیسر محمد فیاض کاوش وارثی ہیں۔ اِس سوانح میں غوث پاکؒ کی ولادتِ مبارک سے لے کر وصال تک کے تمام اہم حالات کو مستند تاریخی کتب سے اخذ کرکے پیش کیا ہے۔ ان مآخذات کی فہرست کتاب کے آغاز ہی میں دے دی گئی ہے، جو تقریباً ۵۰ کتب پر مشتمل ہے۔ اِن میں حضرت غوث پاکؒ سے لے کر ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ تک کے مصنف و مؤلف شامل ہیں۔

"پیرانِ پیر" میں صرف شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے حالاتِ زندگی ہی شامل نہیں ہیں بلکہ اُس دور میں عالمِ اسلام کی سیاسی اور اخلاقی صورتِ حال کو بھی پیش کیا ہے۔ اسی طرح دیگر مذاہب اور فرقوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں، جس سے نہ صرف اُس عہد کی تفہیم میں مدد ملتی ہے بلکہ غوث پاکؒ کی خدمات کی وقعت اور اہمیت کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس سوانح کی خوبیوں کا اندازہ ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ کے اس بیان سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

"اس کتاب میں "ولادت" سے لے کر "وفات" تک سیرتِ غوث اعظمؓ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کی آمد آمد سے قبل عالمِ اسلام کی ناگفتہ بہ حالت، ولادت کے متعلق پیشگوئیاں، والدین کی تقوا شعاری کے حیرت انگیز واقعات، خود آپ کے بچپن کا صداقت شعاری سے متعلق ایک بے مثال واقعہ، تعلیم و تربیت، دورانِ تعلیم شدائد و مصائب، تبحرِ علمی، تاثیرِ وعظ و نصیحت، آپؒ کی عبادت و ریاضت کی کیفیت، فقر پسندی، دولت و امارت سے نفرت اور روز مرّہ زندگی کے کام کاج، سودا سلف بازار سے خریدنا، گلی کوچوں میں بچوں کو بُلا بُلا کر مٹھائی تقسیم کرنا، آپ کی کرامات و خوارق، مقامات و درجات، فیوض و برکات، اولاد و سجادگان اور تصانیف وغیرہ پر جامعیت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ نیز گیارہویں شریف کے متعلق تمام ضروری معلومات اور معترضین کے اعتراضات کے معقول جوابات بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنے موضوع پر حاوی ہے۔"(۱۴)

کتاب کے محرکات پر مصنف نے تو کوئی واضح اشارہ نہیں دیا ہے، لیکن انتساب سے پتا چلتا ہے کہ یہ عقیدت کے جذبے سے تحریر کی گئی ہے۔ انتساب میں تحریر کیا گیا ہے کہ ''بنامِ نامی۔۔۔ پیرو مرشد حافظ، حاجی۔۔۔ ''وارث علی شاہ'' قدس سرہ العزیز جن کی غلامی کا تمغہ مجھے دربارِ غوث الاعظم سے عطا ہُوا۔''(۱۵) دوسری بات یہ کہ سوانح نگار پروفیسر فیاض احمد کاوشؔ کی صحبت اہل محبت اور اہلِ علم کے ساتھ بہت زیادہ رہتی تھی۔ اس لیے ایک ایسی تصنیف تحریر فرمائی، جس میں علمی اور کسی حد تک تحقیقی انداز ہے اور یہ اہلِ محبت کے ذوق پر بھی پورا اترتی ہے۔ تیسرا محرک گیارھویں شریف کی حقیقت کو اجاگر کرنا بھی ہے۔ جس پر مصنف نے آخر میں تفصیلی اور تاریخی حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ کیوں کہ بہت سے مسلمان اس پر مختلف انداز سے اعتراضات کرتے ہیں۔ ان میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں، جن کے اکابرین ماضی میں اس پر عمل کرتے رہے تھے۔ مصنف نے ان بزرگوں کی کُتب ہی سے اقتباس دے کر گیارھویں شریف کے منانے کو ثابت کیا ہے۔

کتاب کا اسلوب علمی وادبی اہمیت کا حامل ہے۔ تشبیہ، استعارے، محاورے، ضرب الامثال سے بنی سنوری ہوئی اردو ہمیں اس سوانح میں کئی مقامات پر نظر آتی ہے۔ اردو اور فارسی اشعار سے اندازِ بیان کے حسن میں مزید اضافہ ہُوا ہے۔ راقم نے مصنف کے ساتھ تقریباً چار سال کام کیا ہے۔ آپؒ کا اندازِ گفتگو بھی دل کش، دل نشین اور بنی سجی اردو کا حامل ہوتا تھا۔ اسلوب کی مثال کتاب کے آغاز ہی سے پیش کی جاتی ہے۔

> ''بغداد کے ایک سنسان راستہ پر ایک نوجوان مسافر چلا جارہا تھا۔ اس نے راستے کے کنارے ایک پریشان حال بوڑھے کو دم توڑتے دیکھا۔ مسافر کو اس بوڑھے کی حالاتِ زار پر رحم آگیا۔ اُسے سہارا دینے کے لیے نوجوان نے قریب جا کر اپنا دستِ شفقت بڑھایا۔ بوڑھے نے بھی اپنا لرزتا ہُوا کم زور ہاتھ اُٹھا دیا۔ مسافر نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے، اِس ناتواں کو سہارا دیا۔ مسافر کے ہاتھ لگتے ہی بوڑھے کی رگوں میں طاقت وتوانائی کی برقی لہر دوڑ گئی، بڑی تیزی سے اس بوڑھے کی حالتِ زار سنبھلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پیلے پیلے مرجھائے ہوئے چہرے پر نو شگفتہ پھولوں جیسی بہار آگئی، پتھرائی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی روشنی عود کر آئی، کچھ دیر پہلے وہ بیمار بوڑھا جو ہڈیوں کا پنجرا نظر آرہا

تھا۔ اب ایک صحت مند نوجون بن کر مسکرا رہا تھا۔ یہ عجوبہ دیکھ کر مسافر کو سخت حیرت ہوئی۔ اس پر اس نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔" (۱٦)

کہ میں دینِ اسلام ہوں، مجھے آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے نئی زندگی بخشی۔ آپ "محی الدین" ہیں۔ اسلوب میں عوامی الفاظ بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ جیسے "کتابیں تو ہر شخص چاٹ سکتا ہے۔ مگر اس طرح عشقِ الٰہی کی دولت نہیں پا سکتا۔"(۱۷) "غلط بات پر خلیفہ تک کو سرِ عام لتاڑ دیتے تھے۔"(۱۸) پروفیسر فیاض احمد کاوش وارثیؒ نے ایک اور مختصر سوانح "سیّدنا غوث پاک" کے نام سے ترتیب دی تھی جو ستمبر ۱۹۸۸ء میں رضا لائبریری میر پور خاص کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب "پیران پیر" کی تلخیص ہے۔ اس لیے سے زیرِ بحث لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

پروفیسر محمد فیاض خان کاوش وارثی کی کتاب "پیرانِ پیر" کو مکتبہ مظہر فیضِ رضا فیصل آباد نے اشاعت، اوّل، ۱۹۸۰ء میں کی، اس کا ایک اور ایڈیشن برکاتی پبلشرز کراچی نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا ہے۔ اس پر بھی بارِ اوّل ہی درج ہے، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس ایڈیشن کو فہرست سے لے کر اختتام تک طبع اوّل کی کاپی کر کے شائع کیا گیا ہے مگر خطاط "خلیل احمد نوری" کا نام نہیں دیا گیا۔ یہی صورتِ حال پروفیسر فیاض احمد خان وارثیؒ کی کتاب "نبی اُمی کی فصاحت وبلاغت" میں پیش آئی اس کے بھی دو ایڈیشن نظر سے گزرے، پہلے ایڈیشن کی کاپی کر کے شائع کیا مگر اس پہلو اور کاتب کا نام کا ذکر نہیں کیا گیا۔ جب کہ "نذرِ کاوش" میں محمد اکرم قریشی لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مکتبہ نبویہ لاہور اور برکاتی پبلی شرز سے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں(۱۹) جب کہ پہلے ایڈیش کا تذکرہ انھوں نے بھی نہیں کیا۔

خواجہ شمس الدین عظیمی کی تصنیف "تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ" سلسلہ عظیمیہ کے بانی حسن اُخریٰ سیّد محمد عظیم برخیاؒ کی سوانح حیات ہے۔ جن کا تخلّص برخیا اور خطاب حسن اُخریٰ تھا۔ آخری الذّکر اویسیہ طریق پر سیّدنا حضورؐ کے دربار سے عطا ہُوا تھا۔ قلندر بابا اولیا آپ کی عرفیت ہے۔ خانقاہی ادب میں سوانحی ادب کی اہمیت مسلمہ رہی ہے کیوں کہ نیک لوگوں کی سیرت سے عوام وخواص کے کردار پر جو مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ دیگر اصناف سے نہیں ہوتے۔ خواجہ شمس الدین عظیمی نے اگرچہ واضح طور پر کتاب کا محرّک بیان نہیں کیا ہے مگر کتاب کے انتساب اور پیش لفظ سے کتاب کے محرکات کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے۔ انتساب اُن نوجوانوں کے نام کیا ہے جو قلندر بابا اولیاؒ کے فیضِ روحانی سے نوعِ انسانی کو راحت و سکون عطا کر کے خوف اور غم کے سائے ختم کریں گے اور انسان کو اس کا ازلی شرف اور مقام جنّت کا

حصول ممکن بنائیں گے، گویا کتاب کا اولین محرک قلندر بابا اولیاؒ کی تعلیمات سے آگہی اور اس پر عمل پیرا ہو کر انسان کا کھویا ہُوا مقام جنت کا حصول ہے۔ جہاں خوف اور غم کے بادل سایہ فگن نہیں ہوتے۔

پیشِ لفظ انتہائی فکری نوعیت کا حامل ہے۔ جس میں انبیا کی تشریف آوری اور اُن سے ہدایت ورہنمائی کا ذکر ہے۔ جس سے انسانیت تاریکیوں سے باہر آتی رہی، پھر ہدایت اور رہنمائی کی اکمل ترین صورت نبی اکرمؐ کی بعثت سے ہوئی۔ آپؐ نے انسانیت کو رہنمائی اور فلاح و بہبود کا وہ اعلاترین معیار عطا کیا، جس کو اب چھونا ناممکن ہے۔ اِس حوالے سے خواجہ شمس الدین عظیمی تحریر فرماتے ہیں۔

> سب سے آخری نبی دو جہانوں کے سردار ہادی دینِ مبینؐ کی آمد، بعثت، خدمت اور کامل انانیت کے عمل پر دفتر لکھے جاچکے ہیں لیکن وجد اور کیفیت اور معرفت اور روحانیت کی گلیوں کے باسی اپنی زبان سے نہیں کہہ رہے ہیں۔
>
> ع   ہنوز نام تو گفتن کمالِ بے ادبی است" (۲۰)

کتاب کا دوسرا محرک لوگوں کے سامنے آپؒ کی تعلیمات پر عمل پیرا ایک ولی کامل کی زندگی کو پیش کرنا مقصود ہے تاکہ یہ خیال ختم ہو جائے کہ موجودہ عہد میں آپؒ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا نہ ممکن ہے۔ ایک مقصد کتاب کو تحریر کرنے کا یہ بھی ہے قلندر بابا اولیاؒ کا مشن اور تعلیمات ساری دنیا میں جاری و ساری ہو جائے۔ ایک مومن کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ عظیمی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ مومن بننے کے لیے ہادیٔ برحق، صحابہ کرامؓ، تابعینؒ۔ تبع تابعینؒ اور پھر اولیاے کرام ہدایت اور رہبری کا ذریعہ بنے۔ (۲۱)

خواجہ شمس الدین عظیمی نے آپؒ کی سوانح کو مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا ہے، یہ عنوانات قلندر بابا اولیاؒ کی شخصیت کے آئینہ دار اور زندگی کے اہم پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ۱۷۴ صفحات پر مبنی، اس کتاب میں حالاتِ زندگی ۳۵ صفحات، جن میں آپ کے نام والقاب کی توجیہ، سن اور جائے پیدائش، تعلیم و تربیت، روحانی تربیت، بیعت، اخلاقِ حسنہ، روحانی مرتبہ، اولاد اور شجرہ شامل ہیں، جب کہ کشف و کرامات ۴۰، ملفوظات ۲۰، مکتوبات ۱۹ صفحات پر مشتمل ہیں، پھر تصنیفات کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ پیش لفظ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ معلومات روحانی ڈائجسٹ کے مختلف شماروں میں شائع ہوئی تھی۔ اِن تمام تحریروں کو محمد یونس عظیمی کی سربراہی میں ایک پینل نے مرتب کیا ہے۔

کرامات کا ذکر اولیائے کرام کی سیرت کا اہم جزو رہا ہے۔ "تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ میں بھی یہ حصّہ طویل ہے اور ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دل چسپی کا حامل ہے۔ ان کرامات میں خدمتِ خلق، سائنسی اور روحانیت کے پہلو ہیں۔ کتاب کا ایک اہم حصّہ آپ کے ملفوظات پر مبنی ہے، جس میں آپ نے روحانی پہلوؤں کی سائنسی توجیہہ کی ہے، اِس جزو کو انسان کا شعوری جزبہ، حواس کیا ہیں؟، اپنا عرفان، اسرار الٰہی کا بحر زخار، دربارِ رسالت میں حاضری اور کُن فیکون کے عنوانات دیے ہیں۔

خواجہ شمس الدین عظیمی نے قلندر بابا اولیا کے حالاتِ زندگی ہی قلم بند نہیں کیے بلکہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی، وہاں روحانی اصطلاحوں کی تشریح بھی فرمائی ہے۔ جس طرح آغاز ہی میں "قلندر" لفظ کی تشریح و توجیہہ بیان کی ہے۔ قلندریہ سلسلے کی ابتدا کے بارے میں تحریر کیا کہ یہ سلسلہ حضرت عبد العزیز مکّی قلندر سے جاری ہُوا، اس بارے میں اختلافی رائے کو حاشیے میں ظاہر کیا ہے جو آپ کی تحقیقی دیانت داری ہے۔ جس کے مطابق یہ سلسلہ حضرت ذوالنون مصریؒ سے شروع ہُوا۔ عبد العزیز مکیؓ اصحاب صفہؓ میں سے تھے اور آپؓ کو قلندر کا لقب آپؐ ہی نے دیا تھا۔ اس اہم رائے کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ قلندر کے مقام کے بارے میں تحریر فرمایا: "اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو قلندری مقام عطا کرتا ہے تو زمان و مکاں (Time and space) کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔"(۲۲)

جہاں تک خواجہ شمس الدین عظیمی کے اسلوبِ بیان کا تعلق ہے، زبان عام فہم ہے۔ عربی فارسی کے نامانوس الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پیشِ لفظ میں خطابیہ انداز میں الفاظ کی تکرار ملتی ہے۔ "اس عرفانِ نفس میں خواہشات اور شہوت کی معرفت نہیں ہے، بدن کی معرفت نہیں ہے، اپنے عزیزو اقارب کی پہچان نہیں ہے، اپنے ماں باپ کی پہچان نہیں ہے، اپنے شہر، گھر اور وطن کی پہچان نہیں ہے، ساری دنیا کے علم کی پہچان نہیں ہے بلکہ پہچان کرنی اور سمجھنی ہے کہ قدرت نے تجھے کیوں پیدا کیا ہے؟"(۲۳) آپ کی نثر کا نمونہ ملاحظہ کریں:

> "اس مشینی دور کے انسان کی مادّی ترقی اور روحانیا باطنی تنزلی کا حال عجیب فکر انگیز ہے۔ سر بفلک، پابہ گِل، سرِ پُر غرور آسمان کی بلندی سے بھی بلند تر اور پائے ناموس ہلاکت و عدم تحفظ کی دلدل میں دھنسا ہُوا۔ ایک بار پھر علاّمہ اقبال کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا، (۲۴)

''تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ ''کو مکتبہ تاج الدین بابا اولیاؒ کراچی نے شائع کیا۔ سن اشاعت درج نہیں ہے۔ پیش لفظ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۲ء کا تحریر کردہ ہے۔

سہیل احمد عظیمی کی تالیف ''باباتاج الدینؒ''، خواجہ شمس الدین عظیمی کی خواہش پر لکھی گئی جو مؤلّف کے مرشد بھی ہیں۔ اس بات کا ذکر سہیل احمد عظیمی نے کتاب کے ابتدائیے میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''تذکرہ تاج الدین بابا'' کی اشاعت کے بعد مرشدِ کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی نے مجھ سے بار بار کہا کہ حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کے حالات زندگی پر ایک بھرپور کتاب لکھو۔(۲۵) یعنی مرشد کی فرمائش کے ساتھ اس کا ایک سبب ''تذکرہ تاج الدین بابا'' بھی بنی، جو قلندر بابا اولیاؒ نے مرتب کی تھی، یہ تذکرہ بھی کتاب کے آخر میں دے دیا گیا ہے کیوں کہ یہ تذکرہ بہت ہی مختصر ہے۔ ممکن ہے اسی لیے خواجہ شمس الدین عظیمی نے اس تمنّا کا اظہار بھی فرمایا ہو۔

سہیل احمد عظیمی نے ''باباتاج الدین'' کی تالیف میں جن کتب اور ذرائع سے استفادہ کیا، اُن میں قطب الدین کی کتاب ''تاج قطبی'' فرید الدین المعروف کریم بابا تاجی کی ''تاج مُراری''، ذہین شاہ تاجیؒ کی ''تاج الاولیا'' اور روحانی ڈائجسٹ کے شمارے شامل ہیں۔(۲۶) سہیل احمد عظیمی کی تحریر کردہ سوانح ''باباتاج الدین'' کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بابا تاج الدین ناگ پوریؒ کے حالاتِ زندگی اور کرامات ہی بیان نہیں کیے گئے ہیں بلکہ کرامات کے ظہور میں آنے کی وجوہ کو بھی زیرِ بحث لائے ہیں، اِس طرزِ تحریر کی ابتدا قلندر بابا اولیاؒ نے کی تھی۔ جب انھوں ''تذکرہ تاج الدین بابا'' میں کشف و کرامات کی علمی توجیہہ بیان کی اور بابا تاج الدینؒ کے اُن علوم کا تذکرہ کیا، جس کا تعلق چار نورانی آبشاروں سے ہے، جو بابا تاج الدین کی روح کے اندر ہمہ وقت جذب ہوتی رہتی ہیں۔(۲۷)

سہیل احمد عظیمی نے کتاب کا آغاز علمی انداز میں کیا ہے ، پہلا عنوان ''روحانی انسان'' ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ کائنات پر غور وفکر کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ دو رخوں پر قائم ہے، ایک انکار اور شکوک کا، دوسرا یقین اور سچّائی کا۔ ثانی الذّکر کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''عام طور پر اس لفظ (سچّائی) کی معنویت اور طاقت پر بہت کم غور کیا جاتا ہے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جیسے ہی یہ لفظ زبان پر آتا ہے، کہنے والا اپنے اندر لامحدود طاقت کے چشمے اُبلتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔''(۲۸) سہیل احمد عظیمی نے بابا تاج الدین کے حالاتِ زندگی کو اختصار سے بیان کیا ہے، جب کہ کتاب کا بڑا حصّہ کرامات پر مشتمل ہے۔

بابا تاج الدینؒ کے سنِ پیدائش میں دو روایات بیان کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف تحقیقی مزاج کے حامل ہیں۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سہیل احمد عظیمی نے حالات کو تنقیدی اور تحقیقی انداز میں پرکھ کر کتاب میں پیش کیا ہے۔ تحریر میں تحقیقی طرز اختیار نہیں کیا، چند ایک مقام پر تو مآخذ کا ذکر کیا ہے مگر بیش تر لوازمے میں ماخذ بیان نہیں کیا ہے، جو حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں، وہ سنین کے اعتبار سے نہیں ہیں، چند ایک واقعات میں عمر کے بارے میں لکھا ہے، جیسے جب آپ کی عمر ایک برس کی تھی تو والد کا انتقال ہو گیا، جب نو سال کے ہوئے تو والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چھے سال کی عمر میں مکتب میں داخل کیا گیا۔ فوج میں شامل ہوئے تو عمر اٹھارہ برس تھی۔ (۲۹)

سہیل احمد عظیمی نے بابا تاج الدین ناگ پوریؒ کے اصلاحی انداز کو بہت سادہ اور جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کا عنوان انھوں نے ''تعلیم و تلقین'' رکھا ہے، اس ضمن میں دو تین واقعات پیش کیے ہیں، ایک کا خلاصہ ملاحظہ کیجیے، ایک سود خور، بابا کے پاس آیا، تو آپ نے ایک لکڑی اٹھائی اور زمین پر مارتے ہوئے کہا بڑا ظالم ہے، مخلوق کو ستاتا ہے، اور کہا، سود لینا چھوڑ دے، اس بات پر اس شخص نے سودی کاروبار کو ترک کر دیا۔(۳۰) مؤلّف نے یہ حکیمانہ نکتہ بھی درج کر دیا کہ، بابا صاحب لوگوں کی خامیوں کو لطیف پیرائے میں اس طرح سمجھایا کرتے تھے کہ، وہ سمجھ بھی جائیں اور ان کی پردہ پوشی بھی رہے، مؤلف کے بقول؛ بابا تاج الدین گفتگو میں اکثر تمثیلی انداز اختیار کرتے تھے۔(۳۱)

کتاب کے آخر میں بابا تاج الدینؒ کے فیضیافتہ افراد کے مختصر تعارف بھی پیش کیے ہیں۔ ان میں حضرت انسان علی شاہؒ، مریم بی امّاں، بابا قادر اولیا، محمد یوسف شاہؒ، خواجہ علی امیر الدین، مہاراجہ رگھوجی راؤ، فتح محمد شاہؒ کملی والے شاہ، رسول باباؒ، اللہ کریم، بابا عبد الرحمان، بابا عبد الکریم، حکیم الدین،

محمد عبدالعزیز عرف نانا میاں، بابا نیل کنٹھ راؤ، سکّو بائی، بی امّاں صاحبہ دوّابابا، نانی صاحبہؒ، محمد غوث باباؒ، قاضی امجد علی، فرید الدین کریم بابا اور قلندر بابا اولیاؒ شامل ہیں۔

سہیل احمد عظیمی کا اسلوبِ بیان رواں اور عام فہم ہے۔ اختصار بھی ان کے اندازِ تحریر کی ایک خصوصیت ہے، جس سے بیان میں دل کشی پیدا ہوئی ہے۔ عموماً اِس اندازِ بیان سے قاری کی دل چسپی قائم رہتی ہے۔ دل چسپی کا ایک سبب ذکرِ کرامات بھی ہے کیوں کہ کتاب کا بیش تر حصّہ کرامات پر مبنی ہے اور یہ واقعات ماضی قریب کے ہیں، تو ان میں صداقت کا پہلو غالب رہتا ہے، انھیں صرف عقیدت مندی پر مبنی واقعات نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے قاری ذوق وشوق سے اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اندازِ تحریر دیکھیے:

''ایک دفعہ بابا تاج الدین کے چند نام لیوا، شکر درہ میں بابا صاحبؒ کی جاے قیام سے کچھ فاصلے پر بیٹھے، آپس میں گفتگو کر رہے تھے، ایک نے کہا میں تم سب لوگوں پر فوقیت رکھتا ہوں، اس لیے کہ مَیں ساری جائیداد چھوڑ کر بابا صاحب کی خدمت میں آیا ہوں۔ دوسرے نے کہا، میری قربانی تم سے کم نہیں ہے، مَیں پوری دکان چھوڑ کر حاضر ہُوا ہوں، غرض ہر شخص اپنی بڑائی جتا رہا تھا، اُسی لمحے بابا صاحب محل سے باہر نکل کر ان لوگوں کے پاس آئے اور یہ قرآنی آیت پڑھی۔

ترجمہ: لوگ اسلام لانے کا آپ پر احسان دھرتے ہیں، کہہ دو، اے نبیؐ! تم اپنے اسلام لانے کا احسان مجھ پر نہ رکھو، یہ تو اللہ کا احسان ہے تم پر کہ تم کو ایمان کی طرف رہنمائی فرمائی۔ (پارہ ۲۶، رکوع ۱۴، سورۂ حجرات ۴۹:۱۷)''(۳۲)

مذکورہ واقعہ سالکین اور روحانیت کے طالب علموں کے لیے ایک ہدایت ہے، انھیں اس قسم کے خیالات، روحانی تربیت کے دوران آتے رہتے ہیں۔ کتاب ''بابا تاج الدین'' کو مکتبہ روحانی ڈائجسٹ کراچی نے ۱۹۸۵ء میں پہلی بار شائع کیا۔

پروفیسر فیاض احمد کاوشؔ وارثیؒ کی سوانحی کتاب ''امام اہل سنت مولانا امام احمد رضا خان بریلویؒ'' ایک مختصر سوانح ہے۔ جس میں اعلیٰ حضرت احمد رضاؒ کے حالاتِ زندگی اختصار سے بیان کیے گئے ہیں۔ سوانح میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے، ان میں سے بیش تر اس کتاب میں شامل ہیں۔ ابتدا میں آپؒ کے خاندانی پس منظر سے آگہی دی گئی ہے کہ امام احمد رضاؒ کا خاندان کب اور کہاں سے ہجرت کر کے

ہندوستان تشریف لایا؟ نیز خاندان کے جاہ و مرتبہ اور علمی و عملی صورت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ خاندان کے پس منظر کے بیان میں متضاد معلومات بھی فراہم ہوئی ہے۔ شروع میں یہ تحریر کیا کہ محمد سعادت یار خان کے بیٹے اعظم خان نے بریلی میں مستقل سکونت اختیار کی اور امورِ سلطنت چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر کے، صاحب کرامت اولیا میں شمار ہوئے۔(۳۳) جب کہ اسی صفحے میں آپ کے دادا محمد رضا علی خان جو عالم اور ولیٔ کامل تھے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "آپ کے خاندان میں انہی کے زمانے میں حکمرانی کا دور ختم ہو کر فقر و درویشی کا رنگ غالب آیا۔"(۳۴)

احمد رضاؒ کے دادا شاہ محمد رضا علی خاںؒ اور والد حضرت مولانا شاہ محمد نقی علی خاںؒ کے بارے میں اختصار کے ساتھ معلومات فراہم کی گئیں، آپ کی زندگی کے اہم پہلوؤں ولادت، نامِ مبارک، گھریلو حالات، تعلیم، حج اور معمولاتِ زندگی کے بارے میں اس قدر معلومات فراہم کر دیں ہے، جس قدر ایک عام قاری کو ضرورت ہو سکتی ہے۔ آپؒ کی علمی خدمات، خداداد ذہنی صلاحیت اور عشقِ رسولؐ کو خصوصی طور پر بیان فرمایا ہے۔

کتاب کے محرک کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے انتساب میں خود کو خادمِ اہلِ سنت تحریر فرمایا ہے۔ دیوبند مکتبۂ فکر اور بریلوی مکتبۂ فکر خود کو اہل سنّت کہلاتے ہیں، یہ دونوں امام ابو حنیفہؒ کے مقلدین میں سے ہیں۔ سوانح نگار کا تعلق بریلوی مکتبۂ فکر سے ہے اور صاحبِ سوانح اس مکتبۂ فکر سے امام اور فروغ دینے والوں میں سے ہیں، یوں اُن سے عقیدت و محبت کا جو رشتہ ہے، وہ اس کتاب کا محرک بنا، دوسرا محرک یہ ہے کہ اپنے بزرگ کی علمی اہمیت کو اجاگر کر کے، اُن کی اہمیت اور عظمت سے نوجوانوں کو آگاہ کیا جائے۔

کتاب کا اندازِ بیان سادگی لیے ہوئے ہے۔ فیاض کاوش کا طرزِ تحریر اس کتاب میں وہ جولانیاں نہیں دکھا رہا ہے جو عموماً ہوتا ہے، لیکن ادبیت اور سنجیدگی موجود ہے۔ عام فہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ کتاب میں ماضی کے مقابلے میں بہتر تحقیقی انداز ہے مگر بہت سی معلومات کے مآخذ نہیں دیے گئے ہیں، کچھ ثانوی مآخذ دیے گئے مگر ان کی اصل نہیں بتائی گئی جب کہ جس کتاب یا رسالے سے معلومات اخذ کی ہیں، اُس کا براہِ راست حوالہ دے دیا گیا ہے۔ جو معلومات کسی کتاب سے اخذ کی گئی ہے، اس کے حوالے آخر میں دیے گئے ہیں۔ ماضی میں یہ حواشی میں دیے جاتے تھے۔ عقیدت کا عنصر بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ طرزِ تحریر کی مثال دیکھیے۔

"آپ بچپن ہی سے دنیاوی آلائشوں سے پاک تھے۔ فطرتاً دین کی طرف مائل تھے۔ دوسرے لڑکوں کی طرح کھیل کود کی طرف ذرا دھیان نہ دیتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ پڑھتے پڑھتے یاد کر لیتے تھے، اسی وقت استاد کو حرف بہ حرف سنا دیتے۔ یہ دیکھ کر استاد محترم دنگ رہ جاتے۔"

"ایک دن وہ فرمانے لگے۔"

"احمد میاں! یہ تو کہو کہ تم آدمی ہو یا جن، مجھ کو پڑھانے میں دیر لگتی ہے مگر تم کو یاد کرتے دیر نہیں لگتی۔"(۳۵)

امام اہل سنت مولانا امام احمد رضا خان بریلویؒ کو رضا انٹرنیشل اکیڈمی صادق آباد نے پہلی مرتبہ ۱۹۹۰ء میں شائع کیا ہے۔

صاحب زادہ محمد زین العابدین راشدی نے "شاہ کارِ ولایت" کو ۱۹۹۹ء میں تحریر کیا مگر اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ جس میں سندھ کے مشہور و مقبول صوفی شاعر شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے حالاتِ زندگی کو سمویا گیا ہے۔ یہ حالاتِ زندگی مختلف سرخیوں کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ جنھیں فہرست میں صفحہ نمبر کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ ۴۴ صفحات پر مشتمل یہ سوانح درج ذیل سرخیوں پر مشتمل ہے۔

خاندانی وجاہت، ولادتِ باسعادت، تعلیم و تربیت، مشائخ عظام، شادی، صورت و سیرت، سیر و سیاحت، تعلیمات، شاہ جو رسالو، سروں کا تعارف، شاہ صاحب کے کلام میں رموزِ تصوّف، مذہب و مسلک، توحید و رسالت، نورِ محمدیؐ، میلاد النبیؐ، مقام محمدیؐ، شانِ محمدیؐ، احکام اسلام، خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرام، چار یار و پنج تن، شہادتِ اہلِ بیتؓ، سرکارِ غوثِ اعظم، صوفیانہ کلام، کر آباد سنسار، معاصر شخصیات، وصال اور روضہ مبارک کی تعمیر۔

مذکورہ بالا عنوانات کے تحت مختصراً اہم اور ضروری معلومات قلم بند کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے شاہ صاحبؒ کے بارے میں اچھی خاصی بنیادی واقفیت ہو جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ ابواب پر بحث پیش کی جائے گی۔ جس سے کتاب کی قدر و قیمت تعین کرنے میں مدد حاصل ہو گی۔ "خاندانی وجاہت" کے ضمن میں شاہ صاحب کے والد اور والدہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں "گوہرِ لطیف" اور "فکرِ لطیف" سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جب کہ ان کتب کے بارے میں مصنف کے نام اور دیگر معلومات درج نہیں کی گئی ہے۔ اگر چہ کہ صفحات نمبر درج کر دیے گئے ہیں جب کہ خاندان کے

دیگر بزرگان کے بارے میں معلومات اس سرخی میں نہیں دی جو "ولادتِ باسعادت" کے تحت درج کر دی گئی ہے۔ یہ عنوان مختصر اور جامع ہے۔ اس میں دو کتب کے حوالے مع صفحہ دیے گئے ہیں مگر دیگر معلومات نہیں ہے۔ "تعلیم و تربیت" کے حوالے سے ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ کی "شاعرِ محبت"، کلیان اڈوانی کے "شاہ جو رسالو" اور اختر لکھنوی کی "شاہ عبداللطیف بھٹائی احوال و آثار" سے معلومات اخذ کی ہیں، لیکن لوازمے کی پیش کش اور حوالے دینے کے انداز سے کچھ الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے، جس سے مصنّف اور کتابوں کے ناموں کا معلوم کرنا آسان نہیں رہتا۔

"شاہ کارِ ولایت" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ایک محرّک تو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے حالاتِ زندگی اور افکار سے اردو داں طبقے کو شناسائی دینا ہے۔ ایک اور اہم مقصد اولیااللہ کی تعلیمات کا فروغ ہے،۔ جس کا تذکرہ مصنف نے کتاب کے ابتدائیہ میں کیا ہے لکھتے ہیں کہ سندھ میں جو اسلامی تعلیمات رائج ہیں، ان کا سہرا اولیا اللہ اور مشائخ کے سر جاتا ہے، اِن میں ایک شاہ صاحبؒ بھی ہیں۔ جنھوں نے لوک کہانیوں اور قصّوں کے ذریعے اپنا پیغام سندھی زبان میں عوام تک پہنچایا، جب کہ اس دور کی سرکاری زبان فارسی تھی۔[۳۶] اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شاہ صاحبؒ ایک روایت شکن شخصیت تھے۔

"شاہ کارِ ولایت" کے اسلوب میں پختگی دکھائی نہیں دیتی، اگرچہ کہ مصنّف جو کچھ کہنا چاہتا ہے، وہ بات قاری تک پہنچ جاتی ہے مگر مختلف کتب سے جو استفادہ کیا گیا ہے، اُس میں بے ربطی بھی نظر آتی ہے۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور دوسری بات جو زیادہ اہم ہے کہ یہ کتاب اُن کے ابتدائی دور کی ہے، جب کہ مصنف زین العابدین شاہ راشدی کی دیگر کتب میں یہ کمی دکھائی نہیں دیتی۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاہ صاحبؒ کے بارے میں جو اختلافی پہلو ہیں، ان پر مدلّل بحث کر کے نتیجے پر پہنچنے کی سعی کی گئی ہے، اِن میں شاہ صاحبؒ کا "امّی" ہونے کے خیال کو غلط ثابت کیا گیا ہے۔ جس کے لیے مختلف محققین کی آرا کے ساتھ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے ایک خط کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، جو ضائع ہو گیا۔ اسی طرح شاہ صاحبؒ کے شیخ طریقت پر بھی بحث کی گئی ہے اور شجرۂ طریقت دے کر ثابت کیا گیا ہے کہ آپ قادری سلسلہ میں بیعت تھے۔ علاوہ ازایں آپ کے کلام سے وہ منقبت بھی پیش کی گئی ہے جو غوث اعظم کی شان میں لکھی گئی ہے۔

"شاہ جو رسالو" کی ضمن میں شاہ جو رسالو کے مرتبین اور شارح کی تفصیل دی گئی ہے، پھر شاہ صاحبؒ کے کلام میں موجود سُروں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اور اُن کے بارے میں تحقیقی بحث شامل ہے۔ سُر کیڈھارو اور سُر وھناسری پر بحث گنجلک ہے، جس کا سبب کتابت کیخامی اور اسلوب کی بے ربطی ہے۔ تصحیح خوانی کی خامیاں پوری کتاب میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ اس حوالے سے اہم ہے کہ مصنف نے شاہ صاحبؒ پر شائع ہونے والی اہم کتب سے استفادہ کر کے اختصار کے ساتھ انھیں پیش کر دیا ہے جس سے مصنف کی شاہ لطیفؒ سے عقیدت کا پتا چلتا ہے۔ "شاہ کارِ ولایت" کتاب آستانۂ قادریہ شادمان ٹاؤن ملیر کراچی سے شائع ہوئی۔ کتاب پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے۔ بقولِ مصنف اس کی تکمیل ۱۹۹۹ء میں ہوئی اور اسے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا گیا۔

"شہبازِ ولایت" صاحب زادہ سید محمد زین العابدین راشدی کی ایک اور تصنیف ہے، جس میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کے حالاتِ زندگی کو تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ کہ یہ ایک مختصر سوانح ہے مگر اس میں لال شہباز قلندرؒ کے بارے میں اُن تمام معلومات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، جسے مختلف کتب میں پیش کیا گیا ہے۔ گویا زیرِ بحث کتاب میں مصنف نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ایک سوانح میں جو ضروری لوازمہ ہونا چاہیے، وہ "شہبازِ ولایت" میں موجود ہے۔ آپؒ کی ولادت، وطن، نسب نامہ، تعلیم و تربیت، مرشد، اسفار، مسلک، علمی حیثیت، تدریسی خدمات، وصال، شادی کے بارے میں بحث، روضے کی تعمیر کی تاریخی حقیقت، حلیہ مبارک اور تصاویر پر منطقی بحث، عرس مبارک اور عرس پر ہونے والی رسومات پر شرعی محاکمہ کیا ہے۔ آخر میں لعل شہباز قلندرؒ پر مختلف شعرا کرام کا منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔

اس سوانح کی کئی پہلوؤں سے اہمیت ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کتاب میں لال شہباز قلندرؒ کے دور کا مختصر تاریخی پس منظر بھی پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جو معلومات فراہم کی گئیں، ان کے مآخذ کو بھی تحریر کیا گیا ہے۔ تیسرے جن معلومات میں اختلاف تھا، اُن کے حقائق تلاش کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی سعی کی گئی ہے۔ اسی طرح ممدوح کے حوالے سے جو غیر حقیقی نظریات اور معلومات کتابوں میں درج ہوئیں یا لوگوں میں مشہور ہیں، اُن کا مدلل اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ردّ کیا ہے۔ جس طرح بعض اہلِ علم نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کو حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کا مرید بیان کیا ہے، مگر سوانح نگار کے خیال میں آپ ابو اسحاق بابا ابراہیم قادری سے بیعت اور خلافت یافتہ تھے۔ (۳۷) لعل شہباز قلندرؒ کے اہلِ

تشیُّعہ ہونے کے نظریے کو دلائل اور کتب کے حوالوں سے ردّ کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ "محمد عثمان" نام اس فرقے میں نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح اسماعیلیوں کی کتاب "Great Ismaili Heroes" میں آپؒ کا نام درج نہیں ہے۔ آپؒ کے لقب لعل اور شہباز کی توجیہ بھی وضاحت سے پیش کی گئی ہے۔ قلندری طریقے کے بارے میں جو عوام میں جو جاہلانہ نظریات ہیں، اُن کا شرعی دلائل سے ردّ کیا گیا ہے۔ قلندر کی تعریف بھی تصوُّف کی اہم کتاب "طبقات الصوفیہ" سے پیش کی کہ "تارک الدنیا، تہجد گزار اور نفسانی لذتوں سے پاک فرد کو قلندر کہتے ہیں۔" اسی طرح کتاب "حدیقۃ السلوک" سے خواجہ عبید اللہ احرار کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "اپنے آپ کو دنیاوی خواہشات سے مجرّد رکھنے اور نفس کو معبود کے تابع کر دینے کو "قلندری طریقت" کہا جاتا ہے۔[۳۸]

"تحفۃ الکرام" اور "اخبار جہاں" میں طوائفوں کو کاروبار کرنے کی اجازت اور "تاریخِ سیوستان" میں آپؒ سے منسوب زمین پر قبضہ کرنے کے واقعے کی تردید بھی کی گئی ہے۔ اسی طرح آپ سے منسوب دو تصاویر میں سے اُس تصویر کو درست قرار دیا ہے جو لاہور کے میوزیم اور "مقالات الشعرا" میں موجود ہے، جس میں سایہ دار درخت کے نیچے جاے نماز پر تشریف فرما ہیں۔[۳۹] "حضرت لعل شہباز قلندرؒ نے شادی نہیں کی تھی۔" ممدوح کی زندگی کے اس پہلو پر اعتراضات کیے گئے۔ سوانح نگار نے نکاح کرنے کی شرعی حیثیت اور اس کی ضرورت کی اقسام بیان کر کے، اس قول کی تردید کی ہے کہ ہے نکاح کرنا ہر حال میں فرض ہے۔ عرس پر ہونے والی بہت سی رسومات کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یہ ہندوانہ رسمیں ہیں جو "شیو" کے پجاریوں میں رائج ہیں۔[۴۰] سوانح کے اختتام پر مزار شریف کے حاضری کے آداب بیان کرنے سے کتاب کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے۔ لال شہباز قلندرؒ اور سید صدرالدین شاہ لکھیاریؒ کے حوالے سے روزنامہ اخبار "مہران" سے اخذ کردہ بیان کو شائع کر دیا ہے جس میں دودھ سے بھرے پیالے اور گلاب کے پھول کا تذکرہ ہے۔[۴۱] یہ روایت اس سے قبل حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی ملتان آمد کے سلسلے میں شیخ عبدالحق محث دہلویؒ نے "اخبار الاخیار" میں درج کی ہے۔[۴۲] یہ واقعہ "شِیر و گلاب" والا واقعہ خواجہ شمس الدین ترکؒ کے پانی پت پہنچنے پر بھی پیش آیا تھا۔ انھیں شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ نے دودھ کا پیالہ بھجوایا تھا۔[۴۳] اس طرح کے واقعات خانقاہی ادب میں تحقیق اور سند کو متأثر کرتے ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا بنیادی محرک لعل شہباز قلندرؒ کے مستند اور معتبر حالات کو عوام و خواص تک پہنچانا ہے۔ اس کے علاوہ مزارات پر بالعموم اور آپؒ کے مزار پر ہونے والی غیر شرعی حرکات کو نمایاں کرنے سے کتاب کا اصلاحی مقصد واضح ہوتا ہے۔ بزرگوں کی سوانح نگاری کا ایک لازمی مقصد اُن کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے تاکہ قاری کی اصلاح اور سوانح نگار کے لیے آخرت کا توشہ بن سکے۔

''شہبازِ ولایت'' کا اسلوب عام فہم ہے۔ زبان و بیان سادہ ہے۔ جملے چھوٹے ہیں، جس سے بات کی تفہیم آسان اور بیان میں روانی پیدا ہو گئی ہے۔ حسبِ موقع فارسی اور اردو اشعار درج کیے ہیں، جن میں علامہ اقبال کے اشعار بھی شامل ہیں جو سوانح نگار کے شعری ذوق کا پتا دیتے ہیں۔ نمونۂ نثر دیکھیے۔

> ''حضرت شہباز ولایت شہباز قلندر مخدوم حافظ سید محمد عثمان سیوہانی قدس سرہ الاقدس اکثر ایک وزنی پتھر گردن میں لٹکا لیتے تھے۔ ایک تو وہ پتھر متبرک تھا اور دوسرا یہ کہ وزنی ہونے کے سبب گردن ہمیشہ جھکی رہتی تھی، اِس سے انسان میں تکبّر پیدا نہیں ہو گا، تواضع وانکساری انسان کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں، جتنی تواضع زیادہ ہو گی، اتنا مرتبہ بلند ہو گا، سر جھکانے کے سبب نظر کی حفاظت ہوتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ بھٹکنے سے محفوظ رہتی ہے اور توجّہ و خیال ہمیشہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب رہتا ہے۔''(۴۴)

زین العابدین راشدی کی کتاب "شہبازِ ولایت" کو السّادات اکیڈمی کراچی نے پہلی مرتبہ ۱۹۹۸ء اور دوبارہ ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔

''تعارف امیر اہلِ سنت'' مجلس المدینۃ العلمیہ کے ''شعبۂ اصلاحی کُتب'' کی مرتب کردہ ہے۔ خانقاہی ادب میں اصلاحی حوالے سے مشائخ کے حالاتِ زندگی ہر دور میں اپنا خاموش کردار ادا کرتے رہے ہیں، یہ الگ بات کہ اُن کے حالاتِ زندگی کے محیرّ العقول واقعات اور دیگر معلومات کا تحقیقی جائزہ لینے میں کچھ تحفظات رہے ہیں۔ مولانا محمد الیاس قادری کے حالاتِ زندگی مرتب کرنے کا محرّک تو اصلاحی ہے، جس کا تذکرہ ''پیش لفظ'' میں کیا گیا ہے۔

> ''صالحین کے حالات وواقعات جاننے میں دلوں کی جِلا، روحوں کی تازگی اور فکر و نظر میں پاکیزگی پنہاں ہے۔ لہٰذا امّت کی خیر خواہی کے مقدس جذبے کے تحت ''مجلس المدینۃ العلمیہ'' نے ''امیر اہل سنت'' کا تعارف مختصراً شائع کرنے کا قصد کیا ہے۔''(۴۵)

پیش لفظ میں آپ کے حوالے سے کچھ اہم معلومات ملتی ہیں، ایک تو ۱۹۸۱ء / ۱۴۰۱ھ میں تحریکِ دعوتِ اسلامی کی بنیاد رکھی۔ جس کا کام اس کتاب کی اشاعت تک ۶۶ ممالک میں پہنچ چکا ہے۔ یہ تذکرہ حالاتِ زندگی میں بھی کیا گیا ہے۔ مولانا محمد الیاس قادری کی زندگی کے بارے میں بنیادی معلومات اختصار سے دی گئی ہیں۔ مگر آپ کے اخلاق و کردار کے بارے میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔ جس کا مطالعہ قاری کے ذہن کو اصلاح کی طرف راغب کرتا ہے۔ یوں تو پوری کتاب ہی عقیدت و محبت کے جذبے کے تحت تحریر کی گئی ہے مگر عشقِ رسولؐ، مکّہ مکرمہ اور مدینے کی محبّت کے بیان میں ایک خاص جذباتی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں آپ کی تصانیف و تالیفات اور دعوتِ اسلامی کے قیام، اس کی ترقی اور خدمات کے بارے میں کافی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ آپ کے اخلاق و کردار کے کئی واقعات درج کیے ہیں، جو قاری کو دینِ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مذکورہ واقعات کی تصدیق کا ایک سبب تو یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں یہ کتاب شائع ہو گئی۔ آپ نے کسی پہلو کی تردید نہیں کی۔ آپ کے اخلاق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ان بُرے حالات میں بھی خود کو نقصان حتّٰی کہ قتل کرنے والے کو تحریری طور پر نہ صرف خود معاف کر دیا بلکہ لواحقین سے بھی اُسے معاف کرنے کی درخواست کی ہوئی ہے، یہی نہیں حضور اکرمؐ کے کرم کے سبب سے اجازت ملی تو، اپنے قاتل کو روزِ محشر جنّت میں لے جانے کا وعدہ بھی فرمایا۔ یہ وہ رنگ ہے جو صوفیاے کرام اور اولیاے عظام کیشان رہا ہے، جس کا حکم قرآن میں سورہ آلِ عمران کی ۱۳۴ ویں آیت میں ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے، غصّہ پینے والے، درگزر کرنے والے اور احسان کرنے والے اللہ کو محبوب ہیں۔ یعنی کسی کی غلطی پر غصہ نہ کرنا پھر معاف کرنا، یہی نہیں پھر اس کے ساتھ احسان کرنا۔

ع لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دوسری وجہ یہ کہ راقم کے دو دوست جو دعوتِ اسلامی کے کچھ پہلوؤں سے اختلاف رکھتے ہیں، ایک نے بتایا؛ کہ انھوں نے محمد الیاس قادری سے اختلاف کرتے ہوئے سخت لہجے میں بات کی تھی مگر اُن کی پیشانی پہ کوئی بل نہیں آیا۔ اسی طرح دوسرے دوست نے اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر کیا، جنھیں کسی علاج سے افاقہ نہیں ہو رہا تھا، آپ کے تعویذ سے صحّت یاب ہوئیں۔ دونوں دوست اعلیٰ تعلیم یافتہ

ہونے کے ساتھ منطقی بھی رہے ہیں ان واقعات سے ممدوح کی شخصیت، کردار اور روحانی مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعے سے محمد الیاس قادری کی شخصیت بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔

کتاب کا اسلوب پُر اثر ہے، وجہ شاید یہ ہے کہ اِسے محبت اور عقیدت سے تحریر کیا گیا ہے، شہروں اور مہینوں کے معروف ناموں کی جگہ محبت میں اُن کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ تمام افراد اسی طرح نام استعمال کرتے ہیں۔ جسے بہت سے لوگ مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ مثلاً مدینۃ الاولیا ملتان شریف،(۴۶)، باب المدینہ (کراچی)(۴۷)، ربیع الاوّل کو ربیع النور شریف(۴۸) وغیرہ۔ زیرِ بحث کتاب کی تیاری میں قرآنی آیات، احادیث اور دیگر کتب سے استفادہ کیا گیا ہے، اُن کے مکمل حوالے دیے گئے ہیں۔ کتاب شائع کرنے کا مخصوص انداز، اس کتاب میں بھی برتا گیا ہے۔ حسب ضرورت امام احمد رضا خانؒ اور محمد الیاس قادری کے اشعار بھی کتاب کی زینت بنے ہیں۔ نمونۂ اسلوب ملاحظہ فرمائیں:

> ''اِس پُر فتن دور میں کہ جب دنیا بھر میں گناہوں کی یلغار، ذرائع ابلاغ میں فحاشی کی بھرمار اور فیشن پرستی کی پھٹکار، مسلمانوں کو بے عمل بنا چکی تھی، نیز علمِ دین سے بے رغبتی اور ہر خاص وعام کا رجحان صرف دنیاوی تعلیم کی طرف ہونے کی وجہ سے اور دینی مسائل سے عدم واقفیت کی بنا پر ہر طرف جہالت کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اسلام دشمن قوتیں مسلمانوں کو مٹانے کے لیے اور اسلام کا پاکیزہ نقشہ بدلنے کے لیے ناپاک سازشیں کر رہی تھیں، مساجد کا تقدّس پامال کیا جا رہا تھا، ہر گھر سینما گھر بنتا جا رہا تھا۔۔۔ مسلمانوں کو یہ ذہن دینا شروع کیا کہ مجھے اپنی اور ساری دنیا کے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرنی ہے۔ 'یہاں تک کہ آپ نے ۱۴۰۱ھ میں "دعوتِ اسلامی" جیسی عظیم اور عالم گیر تحریک کے مدنی کام کا آغاز فرما دیا۔''(۴۹)

راقم کی یہ رائے ہے کہ خانقاہی ادب میں اصلاحی حوالے سے مشائخ کے حالاتِ زندگی ہر دور میں اپنا خاموش کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ اُن کے حالاتِ زندگی کے محیر العقول واقعات اور دیگر معلومات کا تحقیقی جائزہ لینے میں اہلِ دانش کے کچھ تحفظات بھی رہے۔ خانقاہی سلسلے اپنا اصلاحی پیغام جاری رکھیں گے اور عقیدت مند حالاتِ زندگی قلم بند کرتے رہیں گے، مناسب تو یہ ہے کہ کم از کم اُن کے سوانح اُن کی زندگی ہی میں شائع ہو جائیں اور اس سے بہ تر صورت یہ ہے کہ وہ خود اپنی خود نوشت

قلم بند کریں۔ رہا معاملہ اس عمل سے خود نمائی کا پہلو نکلتا ہے تو نیتوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے کیوں کہ مشائخ، جن کا مقصد عوام و خواص کی اصلاح ہے تو اُنھیں زندگی میں ایسے واقعات اور تجربات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جن سے آگاہی ہونے کی صورت میں دیگر مبلّغین اور مصلحین بہ تر طور پر اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ اپنی زندگی کے کچھ واقعات تحریر کرنے کی روایت خانقاہی ادب میں رہی ہے مگر مکمل کتابی صورت محمد مظہر بقا کی ''حیاتِ بقا'' اور سیّد منور شاہ جیلانی قادری کی ''پچاس سالہ کہانی اپنی زبانی'' میں نظر آئی۔ راقم اس عمل کو درست بلکہ بہتر سمجھتا ہے، ایسی صورت میں جب کہ بہت سے مشائخ عاجزی اور انکساری یا مصروفیت کے سبب عقیدت مندوں اور محققین کو اپنی زندگی اور علمی خدمات سے آگاہی نہیں دیتے۔ وہ محققین کی مشکلات سے واقف نہیں ہوتے اور محققین اُن کے معاملات سے بے خبر ہوتے ہیں، یوں باہمی خوش گمانی میں کمی کا امکان رہتا ہے جو کسی بھی صورت خانقہیت کے لیے مناسب نہیں ہے۔

مذکورہ کتاب کو مکتبۃ المدینہ کراچی نے مارچ ۲۰۰۷ء میں شائع کیا، جب کہ پسِ سرورق میں تصدیق نامے پر ۲۸ فروری ۲۰۰۷ء درج ہے۔

شہزاد احمد عظیمی کی تحریر کردہ ''تذکرہ خواجہ شمس الدین عظیمی''، سوانح نگار کے مرشد کے مفصّل حالاتِ زندگی اور علمی خدمات کے بارے میں ایک جامع تصنیف ہے۔ جس میں مصنف نے صاحبِ تذکرہ کے خاندانی پس منظر، والدین کے حالات، بچپن، جوانی اور معاش کا ذکر کیا ہے۔ ان واقعات میں ہجرت کے درد انگیز واقعات بھی شامل ہیں جو قیامِ پاکستان کے بعد پیش آئے تھے۔ علاوہ ازیں خواجہ شمس الدین عظیمی کے باطنی سفر کی روداد کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سالک کو کون کون سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپ کی زندگی کے یہ پہلو یقیناً روحانیت کے طالب علموں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ نیز جو مصائب سالکین کو پیش آسکتے ہیں، ان سے آگہی بھی مسافرِ طریقت کو ذہنی طور پر برداشت کی قوّت عطا کرتی ہے۔

قلندر بابا اولیاؒ نے جس نہج پر خواجہ شمس الدین عظیمی کی باطنی تربیت فرمائی، اسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح روحانیت کے فروغ کے لیے عظیمی صاحب نے جس قدر کاوشیں کیں اور آپ کے نظریاتِ تصوّف پر علاحدہ علاحدہ باب مختص کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کی علمی، دینی اور خدمتِ خلق کا تذکرہ بھی جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے، بالخصوص آپ کی تحریر کردہ کتب کا مختصر

تعارف، محققین کے لیے بہت کارآمد ہے۔راقم کو اس تذکرہ کے ذریعے ''خطباتِ ملتان'' کے نئے ایڈیشن کتاب کا طبع اوّل کا سنِ اشاعت معلوم ہُوا کیوں کہ اصل کتاب میں اشاعت کی تفصیل بالکل ہی نہیں دی گئی ہے۔مذکورہ کتاب کی اہمیت اس حوالے سے بھی ہے کہ اس میں صرف خواجہ شمس الدین عظیمی کے حالاتِ زندگی ہی سے واقفیت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس میں روحانیت کے بہت سے اہم نکات کی تشریح و توضیح بھی عام فہم انداز میں مل جاتی ہے۔چند ایک مقامات پر تو سادہ اور رنگین نقشوں کی مدد سے بھی روحانیت کے مدارج کو سمجھایا گیا ہے۔(۵۰)

''تذکرہ خواجہ شمس الدین عظیمی'' کو گیارہ(۱۱) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔جن کے عنوانات یہ ہیں۔تاریخی و فکری پس منظر، خاندانی پس منظر، بچپن، جوانی، معاش، حضور قلندر بابا اولیاؒ سے ملاقات، تربیت(روحانی)، باطن میں تفکر، سلسلہ عظیمیہ کا قیام، مراقبہ ہال کا قیام اور مجلس۔مراقبہ ہال کے قیام والے باب میں سلسلۂ عظیمیہ کے مختلف شعبوں اور خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔جس میں خدمتِ خلق، شعبۂ تعلیم و تربیت، شعبۂ نشرواشاعت، شعبہ تعلقات عامّہ اور شعبۂ اطلاعات کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اس تذکرے میں یقیناً مصنف نے کئی کتب سے استفادہ کیا مگر ان کا ذکر نہیں کیا یعنی تحقیقی اصولوں کو مدِّنظر نہیں رکھا۔اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔موضوعات میں باہمی ربط بھی منطقی ہے۔ابواب کے عنوان میں اختصار بھی ایک خوبی ہے۔ اگرچہ اس اختصار کے باعث ایک دو مقام پر تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

زیرِ بحث تذکرے کے محرکات کا ذکر شہزاد احمد عظیمی نے دیباچے میں کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ مرکزی مراقبہ ہال کی مرکزی لائبریری میں کتب کی فہرست مرتب کر رہے تھے، تو ان کے ذہن میں اپنے مرشد کے حالات جمع کرنے کا خیال آیا، پھر اس خیال میں مزید استحکام اُس وقت آیا، جب انھوں نے خواب میں مرشد کا انٹرویو لیا، جب اس انٹرویو کا ذکر اپنے مراد خواجہ شمس الدین عظیمی سے کیا، تو تذکرے کی ترتیب کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔اس تحقیق میں جن افراد نے معاونت کی، ان کے نام بھی اشاعتی تفصیل میں دیے ہیں۔ان میں عدنان عظیمی، روبینہ سعید عظیمی، محمد حسین عظیمی، پروین رشید عظیمی، محمد ذیشان عظیمی، عالیہ عظیمی، اشفاق حسین عظیمی، نسیم عظیمی، محمد اعظم عظیمی، سیما ناز عظیمی، عمران خان اور ماجد عظیمی شامل ہیں۔

شہزاد احمد عظیمی کا ''تذکرہ خواجہ شمس الدین عظیمی'' میں اسلوب بیان نہایت سادہ اور رواں ہے۔ الفاظ بھی عام فہم ہے۔ کہیں کہیں عبارت صاحبِ تذکرہ کی زبان میں پیش کی گئی ہے۔ واقعاتی رنگ نے بھی کتاب کو دل چسپ اور پُر اثر بنایا ہے۔ جہاں علمی اور فکری پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، وہاں اسلوب میں ایک خاص علمی انداز نظر آتا ہے۔ بعض مقام پر عقیدتی رجحان بھی دکھائی دیتا ہے۔ شہزاد احمد عظیمی کا طرزِ تحریر ملاحظہ کیجیے:

> ''ہر آدمی سونے کے بعد بیدار ہوتا ہے، بیداری کے بعد جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ شعوری حواس میں داخل ہوتا ہے۔ ہم اس کیفیت کو نیم بیداری کی حالت کہہ سکتے ہیں، نیم بیداری سے مطلب یہ ہے کہ ابھی آدمی پوری طرح شعور میں داخل نہیں ہُوا ہے لیکن جیسے ہی وہ سو کر اُٹھنے کے بعد بیداری کی پہلی کیفیت میں داخل ہوتا ہے، اس کے نفس میں فکر و عمل کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ بیداری کے حواس میں فکر و عمل کی جو طرزیں ہیں، وہ سب یک جائی طور پر دور کرنے لگتی ہیں۔ نیم بیداری کے بعد دوسرا وقفہ شروع ہوتا ہے، اس میں آدمی کے ہوش و حوّاس میں گہرائی پیدا ہوتی ہے، ہوش و حواس کی اس گہرائی سے دماغ کے اوپر خمار ہوتا ہے، وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقفے میں سُرور کی کیفیت بڑھ جاتی ہے، کبھی کم ہو جاتی ہے، اِس کیفیت سے دائرہ قلب متحرک ہو جاتا ہے۔ سرُور کے احساسات گہرے ہونے کے بعد تیسری کیفیت وجدان کی ہے، وجدان بیداری کا تیسرا وقفہ ہے۔ وجدان میں دائرہ روح کام کرتا ہے۔''(۵۱)

شہزاد احمد عظیمی کی تصنیف ''تذکرہ خواجہ شمس الدین عظیمی'' کو الکتاب پبلی کیشنز کراچی نے جنوری ۲۰۰۸ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔

سیّد منور علی جیلانی قادری کی کتاب ''اخبار الصبر والشکر عن حیاتِ السیّد منور'' ایک خود نوشت ہے۔ سرورق پر بڑے جلی لفظوں میں ''پچاس سالہ کہانی اپنی زبانی '' بھی تحریر ہے۔ اِس خود نوشت میں انھوں نے اپنی پچاس سالہ زندگی کو قرطاس پر نقش کر دیا ہے۔ خانقاہوں سے متعلق افراد یعنی مشائخ، خلیفہ یا مریدین کی بہت کم تعداد ایسی ہے، جنھوں نے اپنے حالاتِ زندگی کو خود تحریر فرمایا ہو، کیوں کہ اس میں نمود نمائش کا گمان ہوتا ہے اور خانقاہی نظام یا تعلیماتِ تصوّف اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس بات کا احساس اس کتاب کے مصنف کو بھی ہے، اس لیے رقم طراز ہیں کہ ''مجھ جیسا کم علم و فہم، بے

عمل و بے چارہ انسان جس کے سینے میں نصف صدی کی اپنی سر گزشت کی داستانیں تھیں کہ حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس مدفون سینہ کو قلم و قرطاس کی پشت پر ظاہر اور باہر کرے گا۔"(۵۲) یہی نہیں خود نوشت کے ہر باب کے اختتام پر "للہِ الحمد" اور "ولک الشکر" تحریر ہے جو آپ کی عاجزی اور انکساری کی صورت ہے کیوں کہ اہلِ اللہ تکبیر اور تشہیر سے اس طرح گریزاں ہوتے ہیں جیسے دو مقناطیس کے وہ سِرے جن پر ایک جیسا چارج ہو۔ اِس خود نوشت کا تحریر کرنے کے محرک مصنف کی زبانی ملاحظہ کریں۔

"الحمد اللہ قدرت نے حافظہ اس قدر قوی عطا فرمایا ہے کہ ایک بار کوئی چیز ذہن کے پردے سے گزرتی ہے تو وہ حفظ کے خانے میں محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ نقوش پچاس سال گزرنے کے باوجود بھی مٹنے نہ پائے ہیں۔ فقیر نے اسے امانت تصوّر کیا، سوچا اگر دنیا سے چلا گیا تو یہ خزانے بھی تیرے ساتھ دفن ہو جائیں گے، کہیں یادوں کی اس امانت میں خیانت نہ ہو جائے، اسی ڈر سے اپنی داستان اپنے ہی قلم سے تحریر کی۔"(۵۳)

دوسرا محرک یہ بھی تھا کہ بعد از وصال کسی مؤرخ کو اگر توفیق ہوئی تو میری زندگی کے بارے میں "جھوٹی سچی باتیں اور کرامتیں لکھ مارے گا۔"(۵۴) خانقاہی سوانحی ادب میں یہ محرک قابلِ تقلید ہے۔ اس سے درست حالات محفوظ ہو جاتے ہیں بہ صورت دیگر حالاتِ زندگی محفوظ نہ ہونے سے ایک فعّال شخصیت کے تجربات سے ہزاروں افراد محروم رہ جاتے ہیں، جب کہ کوئی دوسرا فرد حالاتِ زندگی کو قلم بند کرے گا تو اُس میں کمی بیشی کا امکان رہ سکتا ہے۔

اس خود نوشت "اخبار الصبر والشکر عن حیاتِ السّیّد منور" سے نہ صرف مصنف کے ذاتی حالات سے آگہی ہوتی ہے بلکہ اُن کے خاندانی بزرگوں کے بارے میں بھی کافی معلومات مل جاتی ہے۔ جن کا تعلق خانقاہ نورائی شریف سے ہے جو حیدرآباد سے جاتے ہوئے بدین ٹریک وے پر ایک ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے سندھ کی اُن اقدار کا پتا چلتا ہے جو مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ رہی ہیں اور اب بتدریج ناپید ہوتی جارہی ہیں۔ مہمان نوازی، خوش اخلاقی، قربانی کا جذبہ، حصولِ علم سے محبت، اللہ اور اس کے رسولؐ سے عشق اور دین کو دنیا پر ترجیح دینا وغیرہ اہم ہیں۔ یہ صفات سندھ کی عوام میں بالعموم اور خانقاہوں میں بالخصوص موجود رہیں ہیں۔ اس خود نوشت میں مصنف نے اُن اکابرین اور مشائخ کرام کا بھی محبت و عقیدت سے تذکرہ کیا ہے، جن سے مصنف کو شرفِ ملاقات ہوا۔ اس طرح

زیرِ بحث کتاب کے توسط سے گزشتہ پچاس سالوں میں موجود اہم دینی شخصیات کے بارے میں معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

زیرِ بحث کتاب میں سیّد منور علی جیلانی قادری نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے اہم واقعات کو بیان کیا ہے۔ جن سے معاشرے کے افراد کے مختلف رویّے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اِن میں بالخصوص سرگرم مذہبی افراد کے ظاہر و باطن کا فرق بآسانی سمجھ میں آتا ہے جو ہمارے معاشرے کا ایک المیّہ ہے۔ جب کہ دوسری طرف اس خود نوشت میں ایسے بزرگوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو خلوص و عاجزی کے پیکر اور ہمہ وقت دوسروں سے تعاون کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان متضاد صفات کی حامل شخصیات سے آگہی سے قاری کو حق و باطل کا پتا چل جاتا ہے اور یوں اُس کی اصلاح کا سامان ہو جاتا ہے۔

زیرِ بحث کتاب بظاہر تو محض ایک خود نوشت ہے مگر یہ ایک ایسے دانا و بینا فرد کی کہانی ہے جو معاشرے کے اتار چڑھاو پر گہری نظر رکھنے والا اور ایک فعّال شخصیت ہے ۔ یہی نہیں اللہ کی رضا کے لیے قربانی دینے کا جذبہ بھی رکھتا ہے تو حق و صداقت کے لیے بے خوف ہو کر پُر خطر میدانِ کارزار میں کود جاتا ہے۔ شریف آباد کراچی میں النصیر اسکوائر کی ''مسجدِ قبا'' میں کئی عرصے سے قبلہ رخ درست نہیں تھا، جس کے لیے مصنف نے بے خوف ہو کر جدوجہد کر کے اپنی بات کو ثابت کرایا اور صفوں کو درست کرایا۔ راقم اس مسجد میں نمازیں ادا کرنے کا شرف حاصل کر تا رہا ہے۔ صفوں کے ترچھے پن سے پتا چلتا ہے کہ اس میں تبدیلی کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک مسافر پر قرآن جلانے جیسا سنگین الزام عائد کیا گیا مگر مصنف کو جب یقین ہو گیا کہ مسافر بے قصور ہے تو اس کے لیے بھرپور کوشش کر کے رہائی دلوائی۔ اس طرح مصنف کی شخصیت کا ایک پہلو عبد الکریم نامی شخص کے حالات زندگی کے بیان میں ہے جو مصنف کو سب سے زیادہ تنگ کرنے والے تین افراد میں شامل ہے، جس کے ظلم و ستم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے آپؐ سے شفاعت کی محرومی کی بد دعا دی گئی ہے مگر اس شخص کی ظاہری خوبیوں کے بیان میں بخیلی سے کام نہیں لیا، بلکہ اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی موجود ہے اور چاہتے ہیں کہ وہ توبہ کر لے اور اپنی آخرت سنوار لے۔ ''مسجدِ رحمت'' کی کمیٹی کے ناروا رویے کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اس خود نوشت میں کراچی سے رونما ہونے والی اُن دو تحریکوں کی ابتدا کا بھی پتا چلتا ہے جو ۸۰ کی دہائی میں شروع ہوئیں۔ ان میں ایک تبلیغی جماعت دعوتِ اسلامی ہے جو آج کل دنیاے اسلام کی دو

بڑی تبلیغی جماعت میں سے ایک ہے، جب کہ دوسری موجودہ سیاسی جماعت متحدہ قومی مومنٹ ہے جو سندھ کی دوسری اور پاکستان کی چند بڑی سیاسی جماعتوں میں سے ایک ہے۔ اس خود نوشت کی اہمیت کئی حوالوں سے ہے ان میں سماجی، سیاسی، اخلاقی اور تاریخی پہلو شامل ہیں۔ مصنف اب جس علاقے بھیم پورہ میں رہائش پذیر ہے، اُس علاقے کے بارے میں تفصیلی معلومات درج کی ہیں، وہاں کے مزارات، مساجد، مدارس، سینمائیں، بازار، مارکیٹیں، قومیتیں، برادریاں، سیاسی جماعتیں، مذہبی جماعتیں وغیرہ کا تذکرہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔

سیّد منور علی جیلانی قادری کا اسلوبِ بیان رواں ہے۔ مصنف کی مادری زبان اردو نہیں ہے مگر اس کتاب میں جو زبان استعمال کی ہے، اس میں اس بات کا شائبہ بھی نہیں ہو تا کہ مصنف اہلِ زبان نہیں ہے۔ کچھ مقامات پر انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ مثلاً ''فل آزادی''(۵۵) حسبِ ضرورت اردو اور فارسی کے خوب صورت اشعار نے ادبی چاشنی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس خود نوشت میں مصنف کے اشعار بھی رقم ہیں۔ اِس شعر میں تخلص استعمال کیا گیا ہے مگر بروزن مَنُوَرْ، جب کہ درست منوّر ہے۔

چھپا رکھا تھا جس کو مدتوں سے دل میں اے منور
ہزار افسوس وہ شرح وبیاں تک بات جا پہنچی

اِس کتاب کی خوبییہ بھی ہے ہر چھوٹے سے چھوٹے اور ہر اہم واقعے کو ایک سرخی کے تحت درج کیا ہے۔ جس کی فہرست بھی کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔ جس سے قاری کو استفادے میں آسانی رہتی ہے۔ ۴۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں شعبۂ نشرواشاعت المرکز الاسلامی الجامعۃ الغوثیہ ٹنڈو محمد خان سے شائع ہوئی ہے۔

سیّد ادیب حسین نے ''ذہین شاہ بابا تاجی'' میں واقعات میں کسی خاص ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ یعنی کتاب کے عنوان والے پہلے صفحے کے بعد جہاں اشاعتی تفصیل آتی ہے، وہاں تعارف کے تحت آپ کی سنِ پیدائش، مقامِ پیدائش، قرآنی تعلیم، نعت خوانی، نعت گوئی اور شعر گوئی کو بیان کیا ہے۔ آخر میں مصنف نے اپنا نام دے دیا ہے، جیسے بات یہاں ختم ہو گئی ہو، پھر ذہین شاہ بابا تاجیؒ سے اپنے تعلق کی تفصیل بیان کی ہے۔ جس سے صاحبِ سوانح کی شخصیت کے کچھ پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور اس دور کے حالات سے آگہی ہوتی ہے۔ اِس حصّے میں ذہین شاہ تاجیؒ کے اُس دور کے اہلِ علم سے تعلقات کا پتا

بھی چلتا ہے، آپ کی شاعری کے کچھ نمونے بھی اس جزو میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ پورا حصّہ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں شائع ہُوا تھا۔ کب شائع ہُوا تھا، اس کا ذکر نہیں کیا۔

اس کے بعد ذہین شاہ بابا کی شاعری کے عنوان میں ان کی شاعری پر مشہور اہل قلم کی آرا، جو ۳۹۶ صفحات پر مشتمل کتاب "مراۃ" میں محفوظ کردی گئی تھی۔ مصنف نے کتاب ''مراۃ'' سے ماہر القادری، جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی آرا کو اخذ کر کے زیرِ بحث کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ماہر القادری کا مضمون ماہ نامہ فاران میں اگست ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ جوش صاحب کی تحریر سے ذہین شاہ تاجیؒ کی سیرت کے کئی پہلو وا ہوتے ہیں۔ ان تحریروں میں ذہین شاہ تاجی کے اشعاروں کے علاوہ اردو اور فارسی کے کئی خوب صورت اشعار بھی زیبِ قرطاس ہوئے ہیں، اس طرح ادیب حسین نے ذہین شاہ تاجی کے ادبی، علمی اور روحانی مقام کے بارے میں انتہائی مختصر اظہارِ خیال کیا ہے، ایک تحریر اپنی بھی شامل کی ہے۔ آخر میں ذہین شاہ بابا تاجی کی سوانح کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

''ذہین شاہ بابا تاجی'' لکھنے کی تحریک مصنف کو کیوں کر ہوئی، اس کا تذکرہ کتاب کے آخر میں اظہارِ تشکر میں کیا گیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اکیڈمی آف لیٹر کے ڈائریکٹر جناب آغا نور محمد پٹھان نے ادارے کی جانب سے ملک کے دانش وروں اور ادیبوں کے حالاتِ زندگی پر مشتمل کتابیں دکھائیں، اور فرمائش کی حضرت محمد طاسین (ذہین شاہ بابا تاجی) کے حالاتِ زندگی کو بھی محفوظ کیا جائے۔ آغا نور محمد پٹھان کی یہ خواہش ''ذہین شاہ بابا تاجی'' کا محرّک اوّل بنی۔ دوسری بات جو کتاب کے اسلوب سے نظر آتی ہے، وہ صاحبِ سوانح سے مصنف کا عقیدت مندانہ تعلّق ہے، جو اس کتاب کو تحریر کرنے کا مقصد بنا۔

کیوں کہ کتاب کے لوازمہ میں مختلف افراد کی تحریریں شامل ہیں۔ اس لیے کوئی خاص طرزِ تحریر نمایاں نہیں ہوتا۔ مصنف کا انداز تحریر سادگی لیے ہوئے ہے، جس میں عمومی رنگ پایا جاتا ہے۔ ایک جھلک دیکھیے:

> ''جامعہ تاجیہ (تص: میں) ایک نشست منعقد کی گئی تھی، جس کے شُرکا میں کراچی یونی ورسٹی کے ڈاکٹر منظور احمد بھی موجود تھے، موضوع گفتگو تھا "نظامِ تعلیم اور مسلمانوں کا زوال" مذکورہ نشست میں حاضرین مجلس نے ذہین شاہ بابا سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر آپ کی دعائیں اور مدد شامل ہو تو ہم لوگ کراچی میں ایک بین الاقوامی یونی ورسٹی قائم

کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس پروگرام پر عمل کرنے کے لیے انور شاہ بابا کی نگرانی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس میں اعجاز میاں کو بھی جزو وقتی طور سے چند ذمّے داریاں سونپی گئی تھیں۔"(۵۶)

اگر سیّد ادیب حسین "اکیڈمی آف لیٹر (اکادمی ادبیات)" کی شائع کردہ کتب کا بغور مطالعہ فرماتے تو اس کتاب کا خاکہ موجودہ صورت سے بہ تر ہوتا۔ چند مقامات پر لوازمے کے درمیان تصاویر نے پیش کش کو متاثر کیا ہے۔ نیز اشاعتی تفصیل بھی نہیں دی گئی۔ پسِ ورق سے پتا چلتا ہے ک کتاب "ذہین شاہ بابا تاجی" کو عظیمی پبلی کیشن کراچی نے شائع کیا۔ راقم کو آغا نور محمد پٹھان ہی کی توسط سے یہ کتاب ملی تھی، جنھوں نے بتایا کہ یہ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی ہے۔

مذکورہ بالا سوانحوں کے محرکات، اسلوب اور تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سوانحوں کے محرکات میں ممدوح سے محبت اور عقیدت کا پہلو نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ اکابرین کے حالات کو محفوظ کرنے کا جذبہ بھی خانقاہی سوانحات کو تحریر کرنے کا اہم محرک رہاہے۔ اصلاحی، اخلاقیاور روحانی تربیت کرنے کا جذبہ بھی ان سوانحوں کی تحریری مقاصد میں شامل رہا۔ اگر چہ کچھ سوانحوں کے اسلوب کا معیار بہت اعلا نہیں ہے مگر جس جذبے کے تحت ہے انھیں قلم بند کیا گیا ہے۔ وہ اسلوب اس مقصد کے لیے مناسب ضرور ہے۔ کچھ سوانح ایسی بھی ہیں، جن میں اسلوب ادبیت کا حامل ہے۔ ان سوانحوں میں موقع کی مناسبت سے تشبیہات اور مثالوں کا استعمال، الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی ساخت بھرپور ادبیت کی حامل ہے۔ غیر جانب دارانہ رویّہ خانقاہی سوانح میں تقریباً معدوم ہی ہوتا ہے۔ ان سوانحوں میں بھی محبت اور عقیدت کا غالب رجحان نمایاں ہے۔ الغرض یہ سوانح عمریاں سوانح نگاری کے فن پر کامل تو نہیں اترتیں مگر اردو ادب اور موجودہ منتشر و مضطرب معاشرے میں ان کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں جا سکتا۔ انھیں اردو کی ادبی تاریخ میں مناسب مقام ملنا بہت ضروری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رفیع الدین ہاشمی: "اصنافِ ادب"، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۰۔

۳۔ سیّد محمد زین العابدین راشدی: انوارِ علمائے اہلِ سنت، لاہور، زاویہ پبلی شر، بار اوّل، ۲۰۰۶ء، ص ۶۶۷۔

۴۔ کاوش، پروفیسر فیاض احمد: "آفتابِ ولایت"، مکتبہ وارثیہ میرپور خاص، شاعت دوم، ۱۹۹۰ء، ص ۳۳۔

۵۔ ایضاً، ص ۴۹۔

۶۔ ایضاً، ص ۵۰، ۵۱۔

۷۔ ایضاً، ۵۱۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۹۔ ایضاً، ۲۴۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۱، ۴۰۔

۱۱۔ سہیل احمد عظیمی: "بابا تاج الدّین"، کراچی، مکتبہ روحانی ڈائجسٹ، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۵۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱۱، ۲۱۰۔

۱۳۔ وقار یوسف عظیمی: "سلسلہ عظیمیہ اور اس کی علمی و سماجی خدمات کا تحقیقی جائزہ"، کراچی، مکتبۂ روحانی ڈائجسٹ، اشاعتِ اوّل، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۵۔

۱۴۔ فیاض احمد خان کاوش، پروفیسر: "پیرانِ پیر" کراچی، برکاتی پبلشر، ایڈیشن اوّل، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۹۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۸۔

۱۹۔ مجلہ نذرِ کاوش، میرپور خاص، شرکتِ اسلامیہ، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۔

۲۰۔ عظیمی، خواجہ شمس الدّین: "تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ"، کراچی، مکتبہ تاج الدین بابا اولیا، سن ندارد، ص ۱۰۔

۲۱۔　ایضاً، ۲۰۔
۲۲۔　ایضاً، ص ۲۳۔
۲۳۔　ایضاً، ص ۱۲۔
۲۴۔　ایضاً، ص ۱۱۸۔
۲۵۔　سہیل احمد عظیمی: " باباتاج الدّین"، ص ۱۰۔
۲۶۔　ایضاً، ص ۱۱۔
۲۷۔　ایضاً، ص ۱۰۔
۲۸۔　ایضاً، ص ۱۳۔
۲۹۔　ایضاً، ص ۲۱۔ ۲۲۔
۳۰۔　ایضاً، ص ۴۵۔
۳۱۔　ایضاً، ص ۴۴۔
۳۲۔　ایضاً، ۴۶۔
۳۳۔　فیاض احمد خان کاوش وارثی، پروفیسر: "امام اہل سنت مولانا امام احمد رضا خان بریلویؒ"، صادق آباد، رضا انٹرنیشل اکیڈمی، اشاعتِ اوّل، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۔
۳۴۔　ایضاً، ۱۰
۳۵۔　ایضاً، ص ۱۳
۳۶۔　زین العابدین راشدی، صاحب زادہ محمد: "شاہ کارِ ولایت"، کراچی، آستانۂ قادریہ، ملیر، سنہ ندارد، ص ۱۔
۳۷۔　زین العابدین شاہ راشدی، صاحب زادہ محمد: "شہبازِ ولایت"، کراچی، السّادات اکیڈمی، اشاعتِ ثانی، ۲۰۰۴ء، ص ص ۱۰۔ ۱۱۔
۳۸۔　ایضاً، ۲۳، ۲۴۔
۳۹۔　ایضاً، ص ۴۱۔
۴۰۔　ایضاً، ص ۴۴۔
۴۱۔　ایضاً، ص ۲۹۔
۴۲۔　شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ: "اخبارالاخیار"، مترجم: مولانا محمد عبدالاحد قادری، لاہور، ممتاز اکیڈمی، سنہ ندارد، ص ۱۷۔

۴۳۔ اللہ دیا چشتی: ''سیر القطاب''، مطبع نول کشور، لکھنو، ۱۹۱۳ء، ص ۱۸۹ بحوالہ مضامینِ تصوف، ص ۱۵۔

۴۴۔ زین العابدین شاہ راشدی، صاحب زادہ محمد: "شہبازِ ولایت"، ص ۳۴۔

۴۵۔ مجلس المدینۃ العلمیہ: ''تعارف امیر اہلِ سنت''، کراچی، مکتبۃ المدینہ، ۲۰۰۷ء، ص ۷۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۴۷۔ ایضاً، ۱۱،۱۰۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۴۹۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۷۶،۷۵۔

۵۰۔ شہزاد احمد عظیمی: ''تذکرہ خواجہ شمس الدین عظیمی''، کراچی، الکتاب پبلی کیشنز اشاعتِ اوّل، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۹، ۱۲۳، ۳۰۵۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۹۰۔

۵۲۔ منور علی جیلانی قادری، سیّد، ''پچاس سالہ کہانی اپنی زبانی''، ٹنڈو محمد خان، المرکز الاسلامی الجامعۃ الغوثیہ، اشاعتِ اوّل، ۲۰۰۹ء، ص ۲۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۴۔

۵۴۔ ایضاً، ۴۔

۵۵۔ ایضاً، ۳۳۷۔

۵۶۔ ادیب حسین، سیّد: ''ذہین شاہ بابا تاجی''، کراچی، عظیمی پبلی کیشن، سنہ ندارد، ص ۷۵۔